خطہ بہاول پور کے چند مغربی اسفار (ایک نوآبادیاتی باشندے کی نظر میں)

A Few Western Trips to the Bahawalpur Region (In the Eyes of a Colonialist)

Saira Irshad

Lecturer, Department of Urdu, Government Sadiq College Women University Bahawalpur, Pakistan

KEYWORDS

Western
Colonial Powers
Travel
Civilization and Culture
Nonnative

DATES

Received 14-07-2021
Accepted 03-09-2021
Published 19-09-2021

QR CODE

ABSTRACT

Where the western colonial powers have had a profound influence on other forms of literature, such a genre of travel journalism in the Bahawalpur region could not be safeguarded. The region is known for its civilization and culture, yet the rumors that have been written from Pakistan to Pakistan remain mournful that the tradition under the influence has stirred. Although the nature of the journals being written in the Bahawalpur region varied, the correspondents here discussed the impact that the west had given them. At the national level, the ambassadors sought for western couples and also showed an attitude of disregarding civilization and culture. At the national level, the ambassadors sought for western couples and also showed an attitude of disregarding civilization and culture. Travelling entrepreneurs separate from their country apart from a new angle and independent thinking, they seem to be lacking in the west. This difference can be seen even more clearly if domestic and international travels are taken into account.

DOI: <https://doi.org/10.54064/negotiations.v1i2.13>

تلخیص

مغربی استعماری قوتوں نے جہاں دیگر اصناف ادب پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے وہیں خطہ بہاول پور میں سفر نامہ نگاری ایسی صنف اس زد سے محفوظ نہ رہ سکی۔ یہ خطہ تہذیب و ثقافت کی پہچان سمجھا جاتا ہے تاہم قیام پاکستان سے تاحال تحریر کیے جانے والے اسفار اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ مغربی اثرات کے زیر اثر اس روایت میں ہلچل پیدا ہوئی۔ خطہ بہاول پور میں تحریر کیے جانے والے سفر ناموں کی نوعیت اگرچہ مختلف رہی تاہم یہاں کے سفر نامہ نگاروں نے ان اثرات کو موضوع بحث بنایا جو مغرب کے عطا کردہ تھے۔ ملکی سطح پر لکھے جانے والے سفر ناموں میں سفر نامہ نگار مغربی جوڑوں کے متلاشی رہے علاوہ ازیں تہذیب و ثقافت کو نظر انداز کرنے کا رویہ بھی دکھائی دیا جب کہ دوسرے ممالک میں اختیار کیے

گئے اسفار میں دو طرح کے سفر نامے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ سفر نامہ نگار اپنے ملک سے الگ ہوتے ہی ایک نئے زاویے اور آزادانہ سوچ کے علاوہ اس احساس کمتری میں مبتلا نظر آئے کہ وہ مغرب سے کہیں پیچھے ہیں۔ اگر ملکی و بین الاقوامی سفر ناموں کو مد نظر رکھا جائے تو یہ فرق اور بھی زیادہ واضح انداز میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

خطہ بہاول پور تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے الگ پہچان کا حامل ہے۔ اس خطے کے ماضی میں جھانکیں تو نہ صرف امیر ریاست کا تصور ابھرتا ہے بلکہ نوابین بہاول پور کی وضع قطع اور خطے کی پہچان کا الگ زاویہ نظر آتا ہے۔ تاہم وقت کی گرد نے جہاں بے شمار چیزوں کو دھندلا دیا ہے وہیں بہاول پور بھی اس حصار سے باہر نہ نکل سکا۔ اس خطے کی قدر و منزلت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں کے نواب صادق عباسی نے پاکستان کے قیام کو استحکام بخشا تاہم موجودہ حالات کے پیش نظر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغربی استعماری قوتیں جیاں دیگر چیزوں پر اثر انداز ہوئیں، وہیں خطہ بہاول پور بھی اس زد سے باہر نہیں نکل سکا۔ غیر افسانوں تخلیقی نثر میں سفر نامہ ایسی صنف ادب ہے جس میں تجربات و مشاہدات کا ایک جہاں آباد ہے۔ سفر نامہ نگار قاری کو اپنے قلم کی بدولت ایسے مقامات کی سیر کراتا ہے کہ جہاں پہنچنا محض تصور شمار کیا جاسکتا ہے۔ شاہد حسن رضوی لکھتے ہیں: "سفر نامہ اپنی کیفیتوں کے اظہار کا نام ہے"¹

یہاں کے سفر نامہ نگار اکثر و بیشتر سفر کا آغاز ہی ایئر پورٹ سے کرتے ہیں تاکہ پاکستانی روایت سے باقاعدہ طور پر چھٹکارا حاصل کیا جاسکے۔ اس کے بعد مغربی طرز کے لباس کو بے پناہ سہارا جاتا ہے نیز ہوائی جہاز میں اتفاق سے کسی انگریز مرد یا عورت کی ہمراہی ان کے سفر کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ یہ سفر نامہ نگار مغربی ممالک میں ایئر پورٹ پہ پہنچتے ہی اس بات کا بخوبی اندازہ لگالیتے ہیں کہ پاکستان کی نسبت دیار غیر میں فلاں فلاں سہولیات بکثرت ہیں اور انگریز ایسی مخلوق بن جاتے ہیں جنہیں محض اپنے کام سے مطلب ہے۔ اسی طرح نظم و ضبط یعنی ڈسپلن کا جائزہ لینے کے لیے ایک طائرانہ نظر کافی سمجھ لی جاتی ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے ملک میں رہتے ہوئے عشق و محبت جیسے لطیف جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مغرب میں پہلی ہی فرصت میں انھیں کوئی نہ کوئی گوری دل دیتے یا لیتے ہوئے مل جاتی ہے۔ حالاں کہ بتایا جاتا ہے کہ مغربی لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔

محمد خالد اختر ایک وسیع المطالعہ ادیب ہیں۔ انھیں مشرقی ادب کے ساتھ ساتھ مغربی ادب میں بھی مہارت حاصل ہے۔ وہ دوران سفر اپنے سامنے آنے والے اشخاص کی ظاہری شکل و صورت، وضع قطع اور بول چال کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف فرضی نام دیتے ہیں جن میں مغربی ناولوں کے مشہور کردار نمایاں ہیں۔ یہ کیفیت محمد خالد اختر کے اکثر سفر ناموں میں ملتی ہے کہ وہ مختلف کرداروں کی سوچ کو اپنے تخیلاتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا سفر نامہ "آنکز آف گریس" لارڈ بائرن کی نظم سے ماخوذ عنوان پر مشتمل ہے، حسب معمول آغاز سفر اور راستے کے واقعات سے اجتناب برتا گیا ہے۔ وہ سفر کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں: "میں اپنے کمرے میں لارڈ جارج گارڈی بائرن کی نظم آنکز آف گریس، آنکز آف گریس کے بول گنگنا تا ہوا جاگھسا جو مجھے کالج کے زمانے سے زبانی یاد ہے اور اب تک نہیں بھولی"²

محمد خالد اختر کے سفر ناموں میں بھرپور انداز سے جزئیات نگاری کی گئی ہے تاہم یہ احساس بھی شدت سے غالب رہتا ہے کہ وہ مغربی اثرات کے سحر سے باہر نہیں نکل سکے، اگرچہ ان کے ہاں ماضی پرستی کا عنصر نمایاں ہے تاہم اپنے بعض اسفار میں انھوں نے تہذیب و ثقافت سے اجتناب برتا ہے۔

1 شاہد حسن رضوی، سہ ماہی۔ الزبیر (بہاول پور: اردو اکیڈمی، 1994)، 344۔

2 محمد خالد اختر، مجموعہ محمد خالد اختر (کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2011ء)، 436۔

خطہ بہاول پور میں ایک اور بڑا نام "محمد کاظم" کا ہے۔ ان کا سفر نامہ "مغربی جرمنی میں ایک برس" کے عنوان سے رسالہ "فنون" میں قسط وار شائع ہوتا رہا جب کہ بعد میں "دامن کوہ میں ایک موسم" کے عنوان سے کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔ محمد کاظم اپنی ایک جرمن کلاس فیلو میں گہری دلچسپی لینے لگے تھے جس کا نام ہجراں تھا۔ دونوں اپنے جذبات بیان کرنے کے لیے لفظوں کے محتاج تھے اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہجراں نے تجویز دی کہ محمد کاظم کو ایک سال تک جرمن زبان سیکھنی چاہیے تاکہ گفتگو با آسانی ہو سکے۔ زبان سے ناواقفیت ان دونوں کی محبت پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ اقتباس ملاحظہ کریں: "ہجراں کا سر میرے سر کے ساتھ جڑا ہوا ہوا تھا اور اس کی گردن اور بالوں سے اٹھتی ہوئی وہی مانوس خوشبو میرے مشام میں بسی ہوئی تھی"³

خطہ بہاول پور کا ایک اور معتبر نام بشری رحمن کا ہے جن کے سفر ناموں میں اگرچہ ان کی اپنی ذات مشرقیت کا بھرپور احساس دلاتی ہے تاہم ثقافتی حوالے سے ان سفر ناموں میں بھی مغربی اثرات کا بھرپور امتزاج ہے۔ ملک کی دیگر اہل علم خواتین کے ہمراہ بشری رحمن دیار غیر کا سفر اختیار کرتی ہیں تو ان اعلیٰ عہدوں پر فائز خواتین کی ہتک اور پھوٹ پین کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔ اسی طرح مغرب میں جو چیز انھیں متاثر کرتی ہے اس پر داد دینے بنا نہیں رہ سکتیں۔ اس مقصد کے لیے وہ فرضی کردار "مارکینی" کا سہارا لیتی ہیں جب کہ اس کی بجائے پاکستانی سوچ کی حامل خاتون سے بھی مدد لی جاسکتی تھی۔ بشری رحمن پانچ ممالک کی سیاحت پر مبنی سفر نامہ "براہ راست" میں مشرقی حوالے سے خود اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ ان کے شوہر کی پیرس آمد کسی خطرے سے خالی نہیں: "اصل بات یہ ہے کہ ہم مارے تعصب کے منہ اٹھائے پیرس چلے آئے ہیں۔ صاحب عالم ہر بہار کے موسم میں پیرس کا رخ کرتے ہیں اور جب واپس جاتے ہیں تو چہرے سے جھانکتی گلابیاں اور رنگ کا دمکتا کندن سو سو چغلیاں کھاتا ہے۔ ہم کہ تصور میں یہ طولی رکھتے ہیں ہر وہ منظر تصور کی بایونک آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں جو ہمارے اندر حسد و رشک کے آلاؤ بھڑکانے میں مدد و معاون ثابت ہو"⁴

محمد اختر مومن کا دو سفر نامے بعنوان "پیرس ۲۰۵ کلومیٹر" اور "سفر تین درویشوں کا" لکھے۔ وہ ان سفر ناموں میں افسانوی رنگ پیدا کرنے کی بجائے حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے حالات و واقعات کو من و عن بیان کرتے ہیں۔ حالاں کہ ہمارے سفر نامہ نگاروں میں پردیس جاتے ہی عشق و محبت کی واردات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور انگریز خواتین پکے ہوئے بیروں کی طرح سفر نامہ نگار کی جھولی میں آگرتی ہیں۔ محمد اختر مومن کا ہاں اس چیز کی قلت دیکھ کر ڈاکٹر انور سجاد کو بھی حیرت ہوئی اقتباس ملاحظہ کریں: "نکلے تیری تلاش میں" اور "پیرس ۲۰۵ کلومیٹر" کے سال تصنیف میں کچھ زیادہ بڑا وقفہ نہیں مگر اس کتاب میں یورپی بیبیاں نہ تو مومن کا پرگرتی ہیں اور نہ ہی اس کے کندھے پر سر رکھ کر سوتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اتنے چھوٹے سے عرصے میں یورپی بیبیوں میں اتنی بڑی تبدیلی کیونکر رونما ہوئی۔"⁵ سفر نامہ "پیرس ۲۰۵ کلومیٹر" میں محمد اختر مومن کا یورپ کی حالات زندگی کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہیں۔ وہاں عورت اور مرد کو یکساں حقوق حاصل ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ آزادی کئی بار وبال جان بن جاتی ہے۔ وہ اپنا مشاہدہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: "ان دونوں میں سودے بازی ہوئی اور جب سودا طے ہو گیا تو "پی داتا" نے ٹرک ایک طرف پارک کر دیا اور خو

³ محمد کاظم، دامن کوہ میں ایک موسم (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1988ء)، 303۔

⁴ بشری رحمن، براہ راست (کراچی: مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ، 1997ء)، 41۔

⁵ روزنامہ، جنگ (کراچی: ادبی صفحہ، شمارہ ۱/ دسمبر 1982ء)

داس کے رنگین خیے میں رنگ رلیاں منانے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد "پی داتا" سیٹیاں بناتا ہوا خیے سے باہر آگیا اور وہ بی بی بھی ہمارے دیکھتے دیکھتے دوبارہ سڑک پر کھڑی ہو کر دوسرے ٹرک ڈرائیور کو ہاتھ ہلانے لگی⁶

محمد اختر مونکا یورپی خواتین کا کرب سے تذکرہ کرتے ہیں کہ یہ خواتین جوانی میں بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہیں اور پھر بڑھاپے میں سسک سسک کر زندگی گزارتی ہیں۔ ان کی رہائش اولڈ ہاؤس میں ہوتی ہے۔ یورپ میں اکثر مالک مکان بوڑھی عورتیں ہیں جو اپنی جوانی کی کمائی سے گھر بناتی ہیں اور پھر جوانی کی مایوسیوں کا انتقام کرائے داروں سے لیتی ہیں۔

"سفر نامہ" سفر تین درویشوں کا "میں محمد اختر مونکا کو کئی مقامات پر اخلاق سوز مناظر دکھائی دیتے ہیں تاہم وہ ایسے موقعوں پر ڈھکے چھپے الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر سفر نامہ نگاروں کی طرح ایسے مناظر کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر: "کنگر اس، سڈنی میں گناہوں کی بستی ہے جہاں بے لذت بھی ہوتے ہیں اور بالذات بھی۔ ڈارلنگ ہر سٹ گناہوں کی اس بستی کی بدنام گلی ہے اور پلازہ ہوٹل گناہوں کی بستی کی اس بدنام ترین گلی میں واقع ہے"⁷

اس خطے کے ایک اور اہم سفر نامہ نگار عمران اقبال اپنے سفر ناموں میں عشق و محبت کا طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ "سفر نامہ" بحر اوقیانوس کے کنارے "میں قیام کے دوران انھیں اتفاق سے دو امریکی لڑکیاں ملتی ہیں۔ وہ ان کے ہمراہ نیا گرافلز دیکھنے جاتے ہیں اور سفر نامہ نگار ایک رومان پرور وقت ان امریکی لڑکیوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ان لمحات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے احساسات و جذبات کو بھرپور انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں پہنچتے ہی انھیں گوریوں کے حسن اور اپنی وارفتگی پر مبنی عشق کی بلاخیزیاں حیرت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ یہ جذبہ سفر نامہ نگار کو حقیقی معنوں میں احساس دلاتا ہے کہ وہ سچے عشق کی تلاش میں منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ "سفر نامہ" پردیس میں کبھی کبھی "میں عمران اقبال ایک انگریز لڑکی 'میریڈ تھ' کے حسن کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: "برفانی رات میں بھی اس کے ہونٹ گلابی تھے، اس کے گالوں پر سرخی چھائی ہوئی تھی۔ یہ لالی کسی میک اپ کی رہین منت نہیں تھی بلکہ وہ عمر کے اس سال میں تھی جہاں زرد پتوں کے موسم میں بھی سرخ گلاب کی خوشبو چار سو پھیل جاتی ہے۔ وہ میرے اتنے قریب ٹھہری ہوئی تھی کہ اس کی گرم سانسوں سے میں اس سرد ترین رات میں بھی جھلنے لگا تھا"⁸

عمران اقبال کے سفر ناموں میں انگریزی زبان کا استعمال بکثرت ملتا ہے۔ کرداروں کی تشکیل اور افسانوی انداز کی بدولت کئی بار یہ چیز شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اپنی دھرتی سے جڑت کس طرح دیارِ غیر میں بکھرتی نظر آتی ہے۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس خطے کے سفر نامہ نگار ثقافتی بحران کا شکار ہوئے ہیں۔

سید ناصر الدین سفری روداد سے پہلے ان ممالک کی مختصر تاریخ، جغرافیہ، اقتصادی صورتِ حال، تجارتی، صنعت و حرفت، تاریخی اہمیت اور مختلف شعبہ جات کے حوالے سے تفصیل کے علاوہ مختلف ممالک کے رقبے، آبادی اور مختلف ممالک کی کرنسی کا پاکستانی کرنسی سے تقابل شامل

⁶ محمد اختر مونکا، پیرس ۲۰۰۵ کلومیٹر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2003ء)، 294۔

⁷ محمد اختر مونکا، سفر تین درویشوں کا (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1992ء)، 158۔

⁸ عمران اقبال، پردیس میں کبھی کبھی (لاہور: الفار او پبلشرز، 2000ء)، 99۔

ہے۔ ناصر الدین کے سفر ناموں میں جہاں معاشی طور پر مغربی ممالک کو طاقت و ثبات کرنے کی کوشش کی گئی وہیں تہذیب و ثقافت کے حوالے سے بھی ان ممالک کو برتر ثابت کرنے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔

ساجد فاروق کا سفر نامہ "مسافر تیرے شہر میں" لندن کی سیاحت پر مشتمل ہے۔ ساجد فاروق لندن کی آزادی کا پاکستانی ثقافت سے تقابل کرتے ہیں لیکن وہاں کی آزادی کو معیوب نہیں سمجھتا بلکہ دوران سفر ایسے جوڑوں پر کسی کا دھیان نہیں ہوتا۔ ہر کوئی اپنے معاملات میں مصروف نظر آتا ہے۔ اس سفر نامے میں ساجد فاروق مغرب کی دوہری ثقافت کے پرچے اڑاتے ہیں۔ بظاہر خوش حال گھرانے میں کسی بھی وقت دراڑ پڑ جاتے تو رشتہ نبھانے کی بجائے فوری طور پر علیحدگی اختیار کر لی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں معصوم بچے بھی زیر عتاب ہوتے ہیں۔ وہ ظاہری و داخلی حالات کا انتہائی عمدگی سے نقشہ کھینچتے ہیں، وہ یونیورسٹی آف ویسٹ سنٹر میں ضروری کاغذات فوٹو کاپی کرانے گئے تو یہ کہہ کر انکار کر دیا جاتا ہے کہ لائبریری بند ہونے سے قبل تمام فوٹو اسٹیٹ مشینیں بن کر دی جاتی ہیں۔ یہ اصول ہے چنانچہ اسے توڑا نہیں جاسکتا۔ ساجد فاروق اصول پسندی پر طنز کرتے ہوئے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

میں اپنے ویزے کی معیاد بڑھانے کے لیے ہوم آفس گیا تھا۔ کاؤنٹر پر موجود گوری چڑی والے نے قطار میں لگے ہوئے آٹھ دس لوگوں کو نظر انداز کر کے ایک گوری چڑی والی لڑکی کو محض اس لیے اپنی باری سے پہلے قطار میں سے پہلے بلا لیا کہ وہ شکل و صورت اور رنگ و نسل سے گوری دکھائی دے رہی تھی مگر جب وہ کاؤنٹر پر آتی ہے تو عقدہ کھلا کہ یہ بھی ہماری طرح ایک غیر ملکی بے وطن مسافر ہے۔ اصلیت کا پتا چلنے پر واپس اسی جگہ بھیج دیا گیا، جہاں وہ پہلے کھڑی تھی۔⁹

اس واقعے سے مغرب کے اصول و ضوابط کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس طرح ان کے ہاں اینوں کا خیال رکھنے کو اولین ترجیح دی جاتی ہے۔ تاہم ہمارے ملک میں صورت حال اس کے برعکس دکھائی دیتی ہے۔ یہاں گوروں کو نہ صرف قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہے بلکہ اپنی خدمات کا بھی بھرپور موقع فراہم کیا جاتا ہے۔

اکبر علی خاں کا سفر نامہ "راہی نگر نگر کا" ترکی و برطانیہ کی سیاحت پر مبنی سفر نامہ ہے۔ اس سفر نامے میں وہ اپنی تہذیب و ثقافت کو پس پشت ڈال کر مغربی حسن پہ مریٹنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اکبر علی خاں دوران سفر گہرے مشاہداتی انداز میں چھوٹے چھوٹے واقعات کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں۔ سفر نامہ "راہی نگر نگر کا" میں انھوں نے مغربی مسائل کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ مشرق کے لوگ بھی جب وہاں کا رخ کرتے ہیں، اپنے آپ کو تہذیب و ثقافت سے الگ کرنے کے بعد اپنی اولاد کے حوالے سے بے پناہ مسائل میں گھر جاتے ہیں۔ لندن میں اتوار کے دن برائی ٹن کی سیر کی گئی۔ یہ سمندر اپنی دل کشی کے باعث تیراکی کے لیے نہایت موزوں تھا۔ اکبر علی خاں کے ہمراہ ان کے دوست فیضان اور رانا صاحب تھے۔ لاہور کے رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے انھیں زندہ دلاں لاہور میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ سفر نامے میں ایک پُر لطف واقعہ بیان کیا گیا، جو کچھ یوں ہے: "رانا ایک قریبی پب میں داخل ہو گیا واپسی پر اس کے ہاتھ میں پرس تھا۔ میں نے پوچھا کہ بھی کیا خریدنے گئے تھے۔ دراصل یار پب کو چندہ دینے گیا تھا۔ وہ کیوں؟ یہ تو برائی کی آماج گاہ ہے۔ نہیں بلکہ یہاں برائی کو ختم کیا جاتا ہے۔ رانا نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ وہ کیسے؟ دیکھو پب میں لوگوں کو شراب فراہم کی جاتی ہے۔ بھی یہ لوگوں کو پلا پلا کر شراب ختم کر رہے ہیں" ¹⁰

⁹ ساجد فاروق، مسافر تیرے شہر میں (لاہور: حماد پبلی کیشنز، 1998ء)، 79۔

¹⁰ اکبر علی خاں، راہی نگر نگر کا (بہاول پور: شاہین رائٹرز انڈیا، 1999ء)، 109۔

رانا صاحب اکبر علی خاں کو لندن کا حقیقی چہرہ دکھاتے ہیں۔ وہ عوامی شاہرہوں اور قحبہ خانوں میں لے جاتے ہیں تاکہ سفر نامہ نگار کی حیثیت سے اکبر علی خاں وہاں کی معاشرتی زندگی کو قریب سے دیکھ سکیں۔ رانا صاحب ان کو سوہو کا علاقہ بھی دکھاتے ہیں جہاں نیم عریاں خواتین سیاحوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے بے قرار نظر آتی تھیں۔

محمد کامران کا سفر نامہ "گ سے گڑیاں سے جاپانی" جاپان کی سیاحت پر مبنی ہے۔ وہ ایئر ہوٹل کی بوکھلاہٹ اور پی آئی اے کے خسارے کے حوالے سے طنز کرتے ہیں کہ اگر طیارے گراؤنڈ اور ایئر ہوٹل سنڈر گراؤنڈ ہو جائیں تو یہ قومی ادارہ اپنا خسارہ کم کر سکتا۔ جاپانی گڑیاں! الوداع" کے ذیلی عنوان سے محمد کامران "می کی" کو اپنی رواجی کے بارے میں بتاتے ہیں جس پر وہ اُداس ہو جاتی ہے اور چاکلیٹ کا ڈبہ خرید کر ان کو تحفہ دیتی ہے جب کہ وہ اپنی ایک کتاب دیتے ہیں۔ محمد کامران روانہ ہوتے ہیں تو اس کی آنکھوں میں اُداسی پھیل جاتی ہے اور وہ مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیتی ہے۔ اگلی صبح وہ رواجی کی گھڑی قریب آنے پر افسردگی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انھیں جاپان میں گزرے شب و روز شدت سے یاد آتے ہیں۔ وہ جاپان سے جدائی پر نوحہ کنناں تھے تاہم انھیں خانہ کعبہ کی الوداعی شام یاد آگئی جب رگ جاں سے قریب ذات سے جدائی کا لمحہ قریب آن پہنچا تو وہ کرب میں مبتلا تھے اور اس حوالے سے اُس کا کہنا تھا: "عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کر فراق ہے اور یہ کہ خود عالم سوز و ساز، علامت ہے۔ اصل میں تو یہ سارا سفر روح کا ہے"¹¹

محمد کامران جاپان کے سفر سے رواجی اختیار کرتے ہیں اور اس سوچ میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ جاپان میں کچھ دن کی قربت انھیں محبت میں مبتلا کر گئی ہے۔ وہ جاپان سے روانہ ہو جاتے ہیں تاہم ان کا دل اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔ حسن عباسی کا سفر نامہ "ہاتھ سے دل جدا نہیں ہوتا" دبئی کی سیاحت پر مبنی ہے۔ حسن عباسی نے سفر کو پرندے کی اڑان، محبت کے رنگ اور رختِ سفر میں آنسوؤں سے مشابہت دی ہے۔ دبئی انٹرنیشنل ایئر پورٹ پہنچنے کے بعد حسن عباسی وہاں کی خوب صورتی پر حیران رہ جاتے ہیں اور اس کا بے ساختہ اظہار بھی کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ رقم طراز ہیں: "وہ قدم جن کے لیے منگیت کی محبت زنجیر نہ بن سکی یہاں بغیر زنجیر کے ساکن ہو گئے جیسے چلنا بھول گئے ہوں"¹²

ہمارے سفر نامہ نگاروں نے پردیس میں محبت کے نئے دروا کیے کسی کے حصے میں ایک محبت آئی اور کوئی درجن بھر محبتوں کا اسیر رہا۔ جب کہ یہ چیز احساس محرومی کی علامت قرار دی جاسکتی ہے کہ اہل مغرب آخر ایسا کون سا تعویذ گھول کر پلا دیتے ہیں کہ سفر نامہ نگار ایئر پورٹ سے اترتے ہی ان کے گن گانے لگتے ہیں اور پورا سفر پردیس کی محبت میں گزر جاتا ہے۔ ملکی سطح پر اختیار کیے جانے والے اسفار پر ایک نظر دوڑائیں تو بھی ثقافتی بحران سے پیچھا چھڑانا ممکن ہے۔ دیارِ غیر کی سیاحت اور وہاں کی خوب صورتی کو پس پشت ڈال کر اگر پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی سیاحت پر بات کی جائے تو اس سلسلے میں جاوید چودھری کا نام اہمیت کا حامل ہے وہ ۹۰ء کی دہائی میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور زیر تعلیم تھے۔ دورانِ تعلیم وہ شمالی علاقہ جات کی سیاحت کے لیے گئے۔ اور بہاول پور سے ان کا سفر نامہ "جب برف گرے گی" شائع ہوا۔ اس سفر نامے میں بتایا گیا کہ ان کی ایک انگریز جوڑے سے ملاقات ہوتی ہے اور پورا سفر اس انگریز خاتون سے گاڑھی اردو میں مختلف طرح کے مباحث اور محبت کی واردات میں گزر جاتا ہے۔ "اس

¹¹http://Urdunetijpn.com/ur/2009/11/20/dr_kamran_ka_Safarnama_Japan. EPI:13, Page.113

¹² حسن عباسی، ہاتھ سے دل جدا نہیں ہوتا (لاہور: حاجی حنیف پرنٹرز، بار اول، 2012ء)، 28۔

کی نظروں کی شعائیں میرے چہرے پر سوئیاں بن کر چھتیں تو میں بے اختیار ہو کر اس کی طرف دیکھتا۔ آنکھیں آنکھوں سے ٹکرائیں اور مرے اندر اس قسم کا احساس پیدا ہوتا جیسے ابھی کسی شرابی نے نشے کی جھونک میں آکر میز پر ہاتھ مار دیا ہو اور شیشے کے نازک سے لاتعداد جام پکے فرش پر گر کر ایک چھنکے سے ٹوٹ گئے ہوں¹³

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے سفر نامہ نگار جہاں مغربی ممالک میں جا کر بھی اپنی ثقافت کو نہ منوا سکے، وہیں اندرون ملک بھی اہل مغرب کو دیکھ کر ہوش بھلا بیٹھے۔

شمالی علاقہ جات کی سیاحت میں اعجاز احمد چودھری کا سفر نامہ "قدم بہ قدم" اہمیت کا حامل ہے۔ اس سفر نامے میں وہ ناقابل تسخیر مہمات کا ذکر کرتے ہیں۔ جب کوہ پیما ایسے خطرناک راستوں پر چل پڑتے ہیں کہ جہاں رکاوٹوں اور پیچیدگیوں سے مسلسل واسطہ پڑتا ہے تو پھر سفر کی صعوبتوں اور عزم و ہمت کے مابین کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ اعجاز احمد چودھری انتہائی منفرد مثالوں کے ذریعے انسانی فطرت کے نمونے پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی جبلت بنیادی طور پر خود غرضی پر مبنی ہے۔ یہ جبلت مشکل گھڑی میں سب کچھ لٹا دینے پر تیار ہو جاتی ہے وہیں معتدل حالات میں اپنا ارادہ بدلتے بھی دیر نہیں لگاتی۔ خود غرضی کی یہ مثال کوہ پیماؤں اور صحرا انوردوں کے زمرے میں بھی آتی ہے۔ یہ لوگ چلتے رہیں تو منزل آسان بنا لیتے ہیں، رک جائیں تو سردی کی شدت اور گرمی کی حدت انھیں پل بھر میں ختم کر دیتی ہے۔ وطن سے دوری اور سنگلاخ پہاڑیوں میں مسلسل قیام یقیناً ایک تھکا دینے والا سفر ہے تاہم انجینئر کور کے فوجی مسلسل قیام اور ایک مشکل کام کی تکمیل میں مصروف عمل تو تھے ہی لیکن انہوں نے جدائی کا غم انھیں نڈھال کر رہا تھا۔ اعجاز احمد چودھری اس حوالے سے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو کچھ یوں ہے: "آسٹریلیا نقل مکانی کرنے والا پاکستانی کیکر سے لپٹا ہوا پایا گیا اور وہ لہو لہان تھا کیوں کہ یہ اس کا وطنی پودا تھا۔ ٹرینیڈاد اور دوسرے کیریبین جزائر کو نقل مکانی کرنے والے انڈین مزدور تنہائی میں دھاڑیں مار مار کر رونے کے لیے انڈیا سے کسی اور دور دراز علاقے سے آئے ہوئے غم میں ڈوبے مزدور کا کندھا ڈھونڈ نکالتے تھے"¹⁴

وطن سے جدائی جہاں ماضی میں انسان کو مجبور و بے کس کر دیتی تھی، وہیں عہد حاضر کے سفر نامہ نگار اپنی دھرتی سے محبت کو پل بھر میں فراموش کر دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ خالق تنویر کے سفر نامے "ذرا وادی نیلم تک" سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس سفر نامے میں وادی نیلم کا دل کش منظر بیان کیا گیا ہے۔ پہاڑ، کھیت، اڑتے پرندے اور گنگناتی ہواؤں کو دیکھ کر خالق تنویر اس افسردگی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ تہذیب و ثقافت کو اُجاگر کرنے کے لیے محض قدرتی مناظر ناکافی ہیں۔ سیاحت کو فروغ دینا ضروری ہے تو پھر حکومت اس حوالے سے ہر پہلو کو مد نظر رکھ کر ہی اپنا ہدف حاصل کر سکتی ہے۔ وہ اپنے مہاجر دوست کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ پیرس ایئر پورٹ پر تھا تو ایک خستہ حال بڑھیا اپنے سامان کے گم ہو جانے پر چیخ چلا رہی تھی جب کہ اس کے خاوند کو رتی بھر پرواہ نہ ہوئی اور جب اس سے وجہ پوچھی گئی تو وہ کہنے لگا: "اپنی زندگی کے ستر سالوں کا سارا اثاثہ گھر بار، دھن دولت اور اولاد، سبھی کچھ لٹا کر یہاں پہنچے ہیں۔ اتنے بڑے نقصان کے مقابلے میں اس معمولی نقصان کا غم بے معنی ہے"¹⁵

¹³ جاوید چودھری، جب برف گرے گی (بہاول پور: سٹیج پبلی کیشنز نائن ہسپتال روڈ، باراؤل، 1991ء)، 90۔

¹⁴ اعجاز احمد چودھری، قدم بہ قدم (لاہور: مشمولہ "الحمر" ستمبر 2017ء)، 90۔

¹⁵ خالق تنویر، ڈاکٹر، ذرا وادی نیلم تک (لاہور: مشمولہ "الحمر"، اکتوبر 2016ء)، 98۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسان مختلف طرح کے تجربات اور حادثات کے بعد زاویہ نگاہ کو کس طرح تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ حالات کے آگے بے بس ہو جائے تو ناکامی اس کا مقدر بن جاتی ہے اور اسے ہر وقت بے چین رکھتی ہے۔ وہ تقدیر کے فیصلوں کی بغاوت کر کے بھی پرسکون نہیں رہتا۔ خالق تنویر اپنے ایک دوست کا واقعہ قلم بند کرتے ہیں جو چینی نژاد خاتون سے شادی کے بعد مستقل طور پر کوالالمپور آباد ہو گیا۔ اسے زندگی کی ہر آسائش میسر تھی تاہم وہ جب بھی پاکستان آتا اس کا موضوع گفتگو زندگی، موت اور عالمی مسائل تک محدود رہتا جب کہ پاکستان قیام کے دوران مختلف شہروں میں اس طرح بھاگ دوڑ کرتا کہ جیسے کوئی قیمتی چیز تلاش کر رہا ہو۔ اسے اپنا وجود ہوا میں معلق دکھائی دیتا ہے اور یہ لگتا ہے دھرتی اب اسے اپنانے کو تیار نہیں۔ وہ اپنے دوست کی بے چینی اور ذہنی پریشانی سے یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ جوانی میں من چاہے خواہوں کی تعبیر پانے کے باوجود ہجرت کا کرب اسے خوف زدہ کر دیتا ہے۔ وہ ان واقعات سے انسان کی بے بسی کو مختلف زاویوں سے اجاگر کرتے ہیں۔ "تہذیب معاشرے کے طرز زندگی اور طرز فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے چنانچہ آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے، سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ سب تہذیب کے مظاہر ہیں" ¹⁶

ماضی میں کہا جاتا تھا کہ جو قومیں تہذیب و ثقافت کو یکسر فراموش کر دیتی ہیں وہ اپنا نام و نشان مٹا دیتی ہیں۔ لیکن خطہ بہاول پور کے اسفار یہ بات سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ آخر ہمارے سفر نامہ نگار اپنی تہذیب و ثقافت سے کیوں نالاں ہیں؟ ایک خطے کی صورت حال مجموعی تاثر پیدا کرتی ہے۔ آنکھوں دیکھے مشاہدات میں بھی اپنی ثقافت کا تڑک لگایا جائے تو اس سے احساس کمتری دور کی جاسکتی ہے۔ اپنی جڑیں کاٹ کر دوسری جگہ منتقلی کا عمل وقتی طور پر تو سرسبز و شاداب کر سکتا ہے تاہم یہ چیز مستقل طور پر بنجر دے گی۔ ہماری شاندار روایات اپنی اصل خوبصورتی کے ساتھ زندہ رہیں تو آنے والی نسلیں بھی انھیں فخر کے ساتھ اپنائیں گی۔ اس کے برعکس ثقافتی بحران تباہی کے دہانے پہ لاکھڑا کرے گا۔ ہماری تہذیب و ثقافت اس بات کی متقاضی ہے کہ مغرب میں شاندار روایات کو اپنے ساتھ لے جائیں جبکہ ہم ان کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور نتیجے کے طور پر اپنی ثقافت سے الگ تھلگ ہو کر مغربی طور طریقوں کو اجاگر کرنے میں مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں۔ حج و عمرہ کے سفر ناموں میں مذہبی عنصر غالب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اسفار میں مخصوص قسم کی عبادات اور اراکین کی ادائیگی کا احوال ملتا ہے تاہم ان اسفار میں بھی مغرب کی مروجہ منت جدید سہولتیں حجاج کرام کو لہجائی ہیں۔ مشہود حسن رضوی، حیدر قریشی، مہر محمد بخش نول، اخلاق احمد مغربی اثرات کی زد سے خود کو نہ بچا سکے۔

خطہ بہاول پور میں تحریر کیے گئے سفر ناموں نے مشرق و مغرب کے اس فرق کو واضح طور پر اجاگر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ نوابین کی سرزمین ماضی میں اپنی الگ پہچان رکھتی تھی اور اب استعماری قوتوں کے زیر اثر اپنی پہچان اور تہذیب و ثقافت سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ یقیناً یہ چیز احساس کمتری کے علاوہ اپنی ثقافت کو ناپید کر رہی ہے۔ آج اگر یہ رویہ جڑ پکڑ چکا ہے تو آنے والے وقت میں تحریر کیے جانے والے اسفار اس دھرتی کو کھوکھلا ثابت کرتے ہوئے اپنے شاندار ماضی کو فراموش کر دیں گے۔ اپنی مٹی سے گندھے ہوئے دیسی لوگ جب اپنی پہچان کو باعثِ شرمندگی سمجھ لیں تو یہ بات کہنے میں کوئی قباحت نہیں کہ ان کے اسفار مغربی استعماری قوتوں سے متاثر ہوئے بنا تحریر نہ ہو سکے۔ خطہ بہاول پور کے سفر ناموں نے مشرق و مغرب کے اس فرق کو واضح طور پر اجاگر کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ نوابوں کی سرزمین جو اپنی الگ شناخت رکھتی تھی اب استعماری قوتوں کے زیر اثر تہذیب و

¹⁶ سید سبط حسن، پاکستان میں تہذیب و ارتقاء (کراچی: مکتبہ دانیال، 1991ء)، 13۔

ثقافت سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اگر اس رویے کو نظر انداز کیا گیا تو مستقبل میں تحریر کیے جانے والے اسفار اس دھرتی کو کھوکھلا ثابت کرتے ہوئے اپنے شاندار ماضی کو فراموش کر دیں گے۔